اسلامی قانون اور نظامِ معاشرت

ترجمہ مولوی ابونصر محمدؐ خالدی صاحب

[یہ اس مضمون کا ترجمہ ہے جو کتاب (Legacy of Islam) میں پروفیسر سانتی لان (David D. Santillane) نے لکھا ہے۔ صاحب موصوف روم کی یونیورسٹی میں دین اسلام کی تنظیمات کے پروفیسر ہیں۔

یہ پوری کتاب اس نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے کہ اسلام گویا زمانۂ ماضی کی ایک چیز ہے۔ ایک مردہ تہذیب ہے جو زمانۂ حال کی تہذیب کے لیے کچھ آثار چھوڑ گئی ہے۔ اسی لیے اس کا نام اسلام کا "ترکہ" رکھا گیا ہے۔

پروفیسر سانتی لان کے اس مضمون میں مغربی ذہنیت نمایاں ہے۔ وہ اسلام کے قوانین معاشرت وتمدن کو اور خود اسلام کو پرانی سامی اقوام کے مذہبی وتمدنی تصورات ونظامات کی ایک اصلاح یافتہ صورت سمجھتے ہیں اور اسکی بنیادوں کا سراغ پچھلی تاریخ میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم حقیقت انکی پردہ پوشی کے باوجود نمایاں ہو کر رہی ہے۔ ہم نے جگہ جگہ اپنے حواشی میں انکی غلطیوں پر تنبیہ کر دی ہے۔ ایڈیٹر]

عرب قدیم کے معاشرتی نظام کی بنیاد خونی رشتہ پر تھی۔ ایک ہی جد کی اولاد یا کم سے کم ایک ہی جد کی اولاد ہونے کا دعوی کرنے والے انسانوں کا ایک گروہ باہمی دفاع کے لیے آپس میں متحد ہوا کرتا تھا۔ اس گروہ کے افراد مشترک طریق عبادت اور مشترک رسوم کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوا

کرتے تھے، مگر سب سے مقدم اور سب سے اہم چیز جو ایک مؤثر برادری پیدا کرتی تھی، وہ یہی خونی رشتہ تھا، خواہ حقیقی ہو یا فرضی۔ عرب قبیلہ درحقیقت ایک بڑا خاندان ہوتا تھا۔

تمام قدیم معاشروں کی طرح عرب میں بھی نظام معاشرت کے اجزائے ترکیبی افراد نہیں بلکہ افراد کے مجموعے ہوتے تھے۔ فرد بجائے خود زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کی اہمیت اس خاندان یا جماعت کی وجہ سے ہوتی تھی جس سے اس کا تعلق ہوتا تھا۔ خاندان ہی اپنے معاشرتی اور قانونی نظریوں کے تحت اپنے تمام افراد کی زندگیوں کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتا تھا۔ خاندان ہی اپنے افراد کے حقوق کا دعویٰ کرتا، ان کے نقصانات کا بدلہ لیتا، ان کی غلطیوں کا جواب دہ ہوتا، ان کی موت کے بعد ان کی جائداد کا مالک ہوتا اور یہ سب اسی سنت کے مطابق ہوتا تھا جس کا تمام قابل لحاظ اقتدار قدیم ترین زمانے سے چلے آنے والے رواج سے ماخوذ تھا۔

اسلام نے اس نظام کو اس کی تمام ضروری خصوصیات کے ساتھ باقی رکھا۔ اس نے صرف ایک عنصر تبدیل کیا یعنی عرب قبیلے کی سیاسی و معاشرتی بنیاد —— خونی رشتہ کو عقیدے کی جماعت میں تبدیل کر دیا۔

قدیم سامی قبیلوں میں پہلے ہی سے عبادت قبائلی زندگی کا مرکز تھی۔ ایک قبیلہ کسی مخصوص بت کو اپنا معبود بنا لیتا تھا اور یہ بت ہی قبیلہ اور قرابت کے تسلسل کی تعیین اور تشخص کا باعث ہوتا تھا۔ قدیم سامیوں کے ہاں کسی بت کی تبدیلی وہی معنی رکھتی تھی جو ہمارے ہاں قوم کی تبدیلی کے ہیں۔

اس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرب معاشرے کو اس کی قدیم ابتدائی بنیاد پر صرف دوبارہ قائم کر دیا[۱] اور اس پر ایسی معاشرتی عمارت تعمیر کر دی جو اس کے عمیق ترین طبعی جذبے کے مناسب تھی۔ یہ

[۱] مصنف یہاں حقیقت کو مسخ کر رہا ہے۔ آنحضرتؐ نے دراصل تمام الٰہوں کی نفی کر کے اور صرف ایک الٰہ (یعنی اللہ) کو واحد معبود قرار دے کر اس بنیاد ہی کو ڈھا دیا جس پر قبائل اور قوموں کا جداگانہ تشخص قائم تھا۔ آپ نے ایک ایسا نظام معاشرت تعمیر کیا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶ پر دیکھئے)

حقیقت ابن خلدون کی بالغ نظری سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی - خاندان اور قبیلے کا ڈھانچہ منہدم کر دیا گیا اسلیے سرداری یا قبائلی عہدیت کا کوئی سوال باقی نہیں رہا تھا - جو شخص اسلام قبول کرتا اس کو تمام تعلقات حتیٰ کہ اپنے رشتوں ناطوں کو بھی بھول جانا پڑتا تھا الا یہ کہ وہ اس کے دینی بھائی ہوں - ابراہیم علیہ السلام کی طرح اس کو خاص اپنے لوگوں سے، جب تک وہ اپنے عقیدے کے پابند رہیں، یہ کہنا پڑتا کہ "میں نے اپنا منہ پھیر لیا ہے اور میں مشرکوں میں نہیں ہوں" اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ، یہ تھیں پیغمبر (صلعم) کے تیار کیے ہوئے معاشرتی نظام کی خصوصیات -

اس اجتماعیت کی گم کردگی سے ہم انفرادیت ابھرتی ہوئی دیکھتے ہیں - اسلام کے بعد سے انسان کا شمار بحیثیت فرد ہونے لگا - اب وہ فرائض و حقوق، کسی قوم سے تعلق ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے عقائد کی وجہ سے حاصل کرتا ہے - "امت اسلامیہ" کی تشکیل ایسے ایک ہی قسم کے عقائد رکھنے والے لوگوں سے ہوتی ہے -

توحید خداوندی و رسالت محمدی پر ایمان لانے والوں اور پیغمبر کے تعلیم کیے ہوئے چند عقائد کو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵ - جو قبائلی کثرت کی جگہ اعتقادی وحدت پر مبنی تھا مصنف اس عظیم الشان کام کو لفظ "صرف" کے ساتھ بیان کر کے اسکی اہمیت گھٹانا چاہتا ہے - مگر کسی صاحب نظر آدمی سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ جن لوگوں کو صدیوں سے الگ الگ خداؤں کی عبودیت نے تقسیم کر رکھا ہو، اور جنکے جذبات، خیالات اور تمدن و معاشرت میں صدہا برس کی توارث نے شرک کے ان اثرات کو گہری جڑوں کے ساتھ جما رکھا ہو، ان کو ایک خدا کی بندگی پر جمع کرنا، قومی و نسلی تعصبات اور معاشرتی تقسیم کی دیواروں کو توڑ کر انہیں ایک کر دینا، اور ان کے جذبات و افکار کی دنیا کو بدل ڈالنا کوئی معمولی کام نہ تھا - یہ دراصل تاریخ کی رفتار کو بدلنا اور ایک نئی تاریخ بنانا تھا - ایک اکیلے شخص کا ۲۳ سال کی مدت میں ایسا زبردست انقلاب برپا کرنا درحقیقت انسانی تاریخ میں ایک نادر واقعہ ہے - ترجمان القرآن

قبول کرنے والوں کو امت اسلامیہ سے رشتہ جوڑنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے ۔ اس نئی قسم کی امت نے اس قدیم قومیت یا قبیلے کی جگہ لے لی جس کی بنیاد خونی رشتہ پر تھی۔ یہ امت دوسری تمام جماعتوں سے مختلف ہے" یہ بہترین امت ہے کہ نیکی پھیلانے اور بدی کو روکنے کا کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ روئے زمین پر حقیقی انصاف اسی کے پاس ہے ۔۔۔۔ اور جس طرح رسول مسلمانوں پر خدا کی طرف سے شاہد ہیں اُسی طرح مسلمان تمام قوموں پر خدا کی طرف سے شاہد ہیں"۔

یہ سب خیالات اسلام کی قدیم ترین تاریخی دستاویز یعنی اس فرمان خداوندی (قرآن) میں پیش کیے گئے ہیں جس کا نزول سنہ ہجری میں مدینۃ النبی میں ہوا۔[۱]

امت اسلامیہ گویا ایک بڑا خاندان ہے جو ہر اس جماعت سے مقابلہ کے لیے تیار ہے جو خدائے واحد کو نہیں پوجتی" ایک ہاتھ سب کے خلاف" جیساکہ ابوبکرؓ نے اہل مدینہ کو خطاب کر کے کہا" اسلام میں ہمارے بھائی غنیمت میں ہمارے شریک اور دشمنوں کے خلاف ہمارے مددگار"۔ اس پورے نظام ملت کے مذہبی اخلاق کی خصوصیت یہ ہے کہ ضرورت کے وقت ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی امداد و حفاظت کا حکم دیا گیا ہے اور باہمی امداد و اعانت قانونی فریضہ خیال کی گئی ہے ۔ حدیث میں ہے کہ" ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کے مانند ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کو تقویت دیتا ہے"۔ یہ خیالات اسلامی قانون کے ہر حصے میں مل سکتے ہیں خواہ وہ اجتماعی ہوں یا انفرادی۔ برادری کا لازمی نتیجہ مساوات ہے ۔ جس طرح سب مسلمان اللہ کے ہاں برابر ہیں اسی طرح آپس میں بھی مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں برتری صرف سبقت اسلام پر قائم ہوتی ہے یا احکام الٰہی کی مکمل اطاعت پر۔ "اے قریش اللہ نے تم سے نسب کے فخر اور جاہلیت کے غرور کو دور کر دیا ہے ۔ تمام انسانوں کے باپ آدم تھے اور آدم کو اللہ نے مٹی سے بنایا ہے"۔ سیاسی و کشوری (Civil) دونوں قسم

---

[۱] یہ غلط ہے۔ قرآن کا نزول سنہ ہجری کے آغاز سے ۱۳ برس پہلے مکہ میں شروع ہوا تھا۔ ترجمان القرآن

کے قانون میں مکمل مساوات اس پورے نظام کی اصل بنیاد ہے۔ عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعری کو جو مشہور ہدایتیں دی ہیں ان میں ہے کہ "لوگوں کو اپنے حضور میں، اپنی مجلس میں اور اپنے انصاف میں برابر رکھو تاکہ کمزور انصاف سے مایوس نہ ہوں اور نہ قوی تمہاری رعایت کی امید رکھیں"۔ یہ ہدایت نامہ مستند ہو یا نہ ہو لیکن یہ باتیں اصول قانون کی ہر ابتدائی کتاب میں مذکور ہیں اور دیوانی قانون اور دوسرے ہر قسم کے معاملات کی بنیاد ہیں۔

قدیم اسرائیلی دینی بھائیوں کی طرح[۱] مساویانہ حیثیت رکھنے والے افراد کی اس ملت کا پادشاہ خود خدا ہے اور وہ اپنے بندوں پر بلاواسطہ اور راست حکومت کرتا ہے۔ قدیم عرب قبائل کے بت اپنے پجاریوں کے محافظ و مربی خیال کیے جاتے تھے۔ اپنے بہترین بندوں کا حامی و ناصر "اللہ" اب قدیم بتوں کی جگہ لے لیتا ہے اور ملت اسلامیہ پر حکومت کرتا ہے۔ ایک قبیلہ کے سردار نے جب اسلام قبول کر کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا کہ "آپ ہمارے آقا ہیں" تو آپ نے فوراً ارشاد فرمایا کہ "آقا اللہ ہے میں نہیں ہوں"۔ اسلام اللہ کی راست حکومت ہی کا دوسرا نام ہے، ایسے اللہ کی حکومت جو اپنے بندوں کا ہر طرح نگراں ہے۔ اصول تنظیم و تعاون جو دوسرے معاشروں میں مملکت کہلاتی ہے، اسلام میں وہ اللہ کی ذات ہے۔ یعنی انتہائی اور آخری قوت مقتدرہ ہی کا دوسرا نام اللہ ہے جس کی ربوبیت مفاد عامہ کے لیے ہوتی ہے۔ حکومت کا خزانہ اللہ کا خزانہ ہے۔ فوج اللہ کی فوج ہے۔ حتیٰ کہ حکومت کے عہدیدار بھی اللہ کے عامل ہیں۔

---

[۱] یہاں پھر مصنف اسلام کا رشتہ قدیم سامی تخیلات سے جوڑنا چاہتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر رہا ہے کہ بنی اسرائیل خدا کو صرف بنی اسرائیل کا خدا سمجھتے تھے۔ اور اسلام میں خدا رب العالمین ہے۔ اسرائیلیوں کے دینی بھائی صرف اسرائیلی تھے مسلمانوں کا دینی بھائی ہر انسان ہے جو رب العالمین کی بندگی و اطاعت میں ان کے ساتھ شریک ہو۔ اسلام کا خدا (Tribal deity) نہیں ہے۔ ترجمان القرآن

ایک فرد مسلم اور اللہ کا تعلق بھی اس سے کچھ کم راست نہیں ہے - اللہ اور مسلمان کے درمیان کوئی وسیلہ یا واسطہ نہیں ہوتا - اسلام میں کلیسا ، پادری یا اصطباغ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے - انسان اور اس کے خالق کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت ہی کیا ہے جب کہ وہ اس کو اس کی پیدائش کے پہلے ہی سے جانتا ہے اور اپنے بندہ کی "شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے"۔ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنی نوع انسان کو اللہ کا آخری پیام پہنچا دیا ہے - اب بندوں کو اللہ کی مرضی سے واقف کرانے کے لیے نہ کسی شارح کی ضرورت ہے اور نہ کسی نائب کی ہے - اللہ کے سامنے انسان موت و حیات دونوں حالتوں میں اپنا آپ ذمہ دار ہے - جس طرح ایک عرب بدو سیدھے سادے طریقہ سے اپنے سردار کو مخاطب کر سکتا ہے اسی طرح ایک انسان بغیر کسی تعارف یا رسم کے اللہ کو بھی راست مخاطب کر سکتا ہے - پیدائش سے موت تک ، بلکہ پیدائش سے پہلے اور موت کے بعد تک بھی انسان اللہ کے روبرو رہتا ہے کیونکہ اللہ کی نظر سے کوئی چیز نہیں چھپ سکتی ، حتیٰ کہ انتہائی پوشیدہ خیال بھی اس کے لیے ظاہر و آشکارا ہے - انسان اپنے اعمال کا آپ ہی تنہا جوابدہ ہے - اللہ کا فیصلہ تنہا اسی کو برداشت کرنا پڑے گا اور قیامت کے دن جب تمام مخلوق اپنے اعمال کا بدلہ حاصل کرنے بلائی جائیگی اس وقت اللہ کے آگے کسی کو کسی کا وسیلہ کام نہ دیگا اور نہ کسی کی شفاعت سود مند ہوگی - انتہائی سخت پروٹسٹنٹ مذہب بھی اس شخصی توحید پرستی کے مقابلہ میں ایک پروہتی مذہب قرار پاتا ہے کیونکہ یہ انسان اور اس کے خالق کے درمیان کسی قسم کی مداخلت حتیٰ کہ مداخلت کے رجحان کو بھی روا نہیں رکھتا -

بے یار و مددگار انسان علیم و خبیر خدا کی گرفت سے محفوظ و مامون رہنے کے لیے کیا کر سکتا ہے بجز اس کے کہ وہ اپنے آپ کو اسی کے سپرد کر دے اور اس کے غضب سے بچنے کے لیے اسی کے دامن رحم میں پناہ ڈھونڈے - اسی لیے اسلام کہتا ہے اللہ سے اللہ ہی کی طرف رجوع کرو (اللھم

(انی اعوذ باللہ منک) حقیقی دین یہ ہے کہ اللہ کے آگے انسان اپنے آپ کو عاجزی کے ساتھ سپرد کردے اور مایوس نہ ہو بلکہ ہمیشہ اسکی عنایات کا امیدوار رہے۔ اسی وجہ سے "اسلام" یعنی کسی شخص کا اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کے سپرد کردینا ہی سچا مذہب ہے کیونکہ اللہ کے مقابلہ میں مذہبی روح کا کوئی اقتضا اس کے سوا نہیں ہے۔ اس طرح اللہ کے مقابلہ میں انسان کو اپنے عجز اور اس کی قدرت کی یافت ہوجاتی ہے۔ یہی مکمل تسلیم، جو اکثر سامیت[۱] کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے، اسلام کی خاص علامت اور دوسری قوموں میں اس کا امتیازی نشان ہے۔ خاص اپنی قوم کے مذہبی رجحان کے ساتھ اس تعلیم کی ہم آہنگی کے موہوم شعور نے شاید پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ اعلان کرنے پر آمادہ کیا کہ آپ خاتم النبیین اور خالص و اصلی دین ابراہیمی کے احیا کنندہ ہیں[۲]۔

---

[۱] پیغمبروں کی تعلیم سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے تو سامیت کی کوئی خصوصیت اسکے سوا نظر نہیں آتی کہ ہر سامی قبیلہ خدا کے ساتھ اپنا خصوصی رشتہ جوڑتا ہے، اپنے آپ کو "ابناء اللہ و احبارہ" سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ ہم خواہ کتنی ہی نافرمانیاں کریں، ہمارے بزرگ ہمکو خدا کے غضب میں گرفتار ہونے سے بچالینگے۔ اسی قسم کے تخیلات یہودیوں میں تھے، اور یہی تخیل کفارہ کی صورت میں عیسائیوں کے اندر موجود ہے۔ اسلام کو اس "سامیت" سے کیا واسطہ؟ مگر یہ بیچارہ یورپین دماغ! اس کی پرورش ہی کچھ اس طور پر ہوئی ہے کہ یہ انسان کو تاریخی قوتوں کا غلام سمجھتا ہے اور انقلابِ تاریخ کے تصور سے عاجز ہے۔ اس غریب کی سمجھ میں یہ بات کہاں آسکتی ہے کہ خدا کا پیغمبر تاریخ بدلنے آتا ہے اور تاریخی قوتوں کا زور توڑ کر ایک نئی تاریخ بناتا ہے۔ تاریخ کے منظر میں پیغمبر کی شخصیت کا زور دیکھ کر اسکی عقل دنگ رہ جاتی ہے، مگر بے چارہ اپنی نارسائی کے ہاتھوں عاجز ہے۔ پیغمبرانہ انقلاب کی بنیادوں کو بھی یہ پرانی سامی تاریخ ہی میں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ حالانکہ صداقت کا زور خود اسکے قلم سے وہ باتیں لکھوا رہا ہے جن میں سے کسی ایک کا سراغ بھی قدیم سامی معتقدات میں نہیں ملتا۔ ترجمان القرآن

[۲] اس عجیب و غریب عبارت کا مطلب کچھ پروفیسر سانتی لانا ہی جانتے ہونگے۔ رسول اللہ کی قوم کا مذہبی رجحان کیا تھا؟ اس کے ساتھ یہ تعلیم کیونکر ہم آہنگ ہوئی؟ اور یہ اس ہم آہنگی کا "موہوم شعور" کیا بلا ہے جس نے ختم نبوت اور احیاء ملت (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۱ پر دیکھئے)

ملّت اسلامیہ کی اساس

"شریعت" یعنی قانون الٰہی

اس برادری کی فطرت ہی قانون کا وہ نیا تصور پیدا کرتی ہے جو اس میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک دینی برادری ہے جو دین کے جھنڈے کے گرد جمع ہوتی ہے، اور اس کے اجتماع کی بنیاد "خدا کی اطاعت" ہے۔ قدیم زمانہ کے لوگوں میں، اور آج ہمارے اس جدید زمانہ میں بھی قانون اُن قواعد و ضوابط کا نام ہے جن کو عوام براہِ راست، یا کسی ایسے ذریعہ سے جو ان کی نمایندگی کرے منظور

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۔ ابراہیمی کا اعلان کرایا؟ یہ لوگ پیغمبر کے نفس کو بھی اپنے نفسیات ہی کے پیمانہ سے ناپتے ہیں۔ یہ خود تو اُن بلندیوں تک پرواز نہیں کر سکتے جہاں پیغمبر رہتا ہے، اسلیے کوشش کرتے ہیں کہ پیغمبری کو ان پستیوں تک اُتار لائیں جہاں یہ رہتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ جس عظیم الشان آدمی نے تاریخ انسانی میں یہ بے نظیر انقلاب برپا کیا تھا وہ اپنے کارنامے کی نوعیت کا پورا شعور رکھتا تھا۔ وہ کسی "موہوم شعور" میں مبتلا نہ تھا بلکہ جس طرح ایک شخص دن کی روشنی میں مرئیات کو صاف دیکھتا ہے، اُسی طرح وہ اپنے خداداد علم کی روشنی میں اس حقیقت کو صاف دیکھ رہا تھا کہ پیغمبری کا کام اس کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اعتقاد و اخلاق اور انسانی تعلقات کا جو متوازن نظام اس نے قائم کر دیا ہے، وہ اب کسی دوسرے پیغمبر کی آمد کا محتاج نہیں ہے۔ اب اگر کوئی مدعی نبوت پیدا ہوگا تو وہ اس توازن کو درہم برہم کرنے والی قوت (Disturbing element) ثابت ہوگا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو بار بار متنبہ کیا کہ میں آخری نبی ہوں، میرے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ ایک آدھ مرتبہ زبان سے ایسا کوئی فقرہ نکلا ہوتا تو یہ شبہ کرنے کی کچھ گنجائش بھی ہوتی کہ شاید یہ کسی "موہوم شعور" کا نتیجہ ہو۔ لیکن قرآن کو جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ ساری کتاب اس "شعور" سے لبریز نظر آتی ہے کہ انسان کو اس کتاب میں آخری اور مختتم ہدایات دی جا رہی ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پوری پیغمبرانہ زندگی میں ہم کو یہی شعور نمایاں نظر آتا ہے کہ آپ نوعِ انسانی کے لیے زندگی کی ایک ایسی شاہ راہ (صراطِ مستقیم) استوار کر رہے ہیں جو قیامت

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

کرتے ہیں اور اس قانون کا ماخذ انسان کی عقل، اس کی خواہش اور اس کی اخلاقی فطرت ہوتی ہے۔ اسلامی تصور اس کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ملت اسلامیہ کا حاکم اعلیٰ و مقتدر کل خود اللہ ہے تو پھر قانون بجز اللہ کی مرضی کے اور کوئی چیز نہیں۔ اسی اصول کے مطابق اللہ، یا دوسرے لفظوں میں اپنے برگزیدہ بندوں کا مقنن، اپنے قوانین نافذ کرتا ہے۔

اس قانون کی اطاعت بیک وقت ایک اجتماعی فریضہ بھی ہے اور دینی حکم بھی۔ اس قانون کو توڑنے والا ہر شخص صرف قانونی نظم و انضباط ہی سے انحراف نہیں کرتا بلکہ ایک گناہ کا بھی ارتکاب کرتا ہے کیونکہ اسلام میں کوئی ایسا حق نہیں ہے جس میں خدا کا حصہ نہ ہو۔ شرعی تنظیم و مذہب اور قانون ایک ہی مشیت کے دو رخ ہیں۔ اللہ کی مرضی امت اسلامیہ کے وجود اور اس کی ہدایت کا ماخذ ہے۔ ہر قانونی مسئلہ میں اولین اہمیت انسان کی نیت کو دی گئی ہے (کیونکہ معاملہ اصل میں خدا کے ساتھ ہے جو نیتوں ہی کے لحاظ سے اعمال کو جانچتا ہے)۔ اصول قانون ہر سوال کو مذہبیات کی طرف رجوع کرتا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱ - تک انسان کی پیش قدمی کے لیے کافی ہو گی اور کسی حد پر جا کر ختم نہ ہو جائیگی کہ اس سے آگے سڑک بنانے کے لیے کسی نئے انجنیر کی حاجت ہو۔ پھر ختم نبوت کے متعلق آنحضرت صلعم کے جو ارشادات معتبر احادیث میں موجود ہیں وہ اتنے صریح، اتنے متعدد اور اس قدر پر زور (Emphatic) ہیں کہ ان کو کسی "موہوم شعور" کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ کامل شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ پروفیسر سانتی لان کو اگر اندازہ ہوتا کہ ایک پیغمبر کی پوزیشن کیسی اہم ذمہ دارانہ پوزیشن ہوتی ہے تو وہ بآسانی سمجھ جاتے کہ ختم نبوت کا اعلان کر دینا کوئی طفلانہ کھیل نہیں ہے جس کو پیغمبر یونہی روا روی میں زبان سے نکال دے۔ یہ بات کہ "دنیا میں اب خدا کی طرف سے کوئی پیغمبر نہیں آئیگا" اتنی بڑی بات ہے کہ ایک ذمہ دار آدمی کامل علم اور پورے وثوق کے بغیر اس کو زبان سے نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر سلسلہ نبوت کے جاری رہنے کا ذرہ برابر بھی امکان ہوتا تو پیغمبر جیسے ذمہ دار شخص کی زبان سے ایسی کوئی بات نہیں نکل سکتی تھی جس سے باب نبوت کے بند ہونے کا وہم تک پیدا ہو سکتا ہو۔ کیونکہ پیغمبر کی طرف سے ایسا قول موجود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اس کو حجت قرار دے کر بعد کے

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

کیونکہ وہی اس کی آخری بنیاد ہے۔

اس قانون کا خاص اختیار اور اس کا طبعی رجحان کیا ہے؟ قرآن اپنے آپ کو قانونِ فطرت سے تعبیر کرتا ہے جو اللہ نے اپنے رحم و کرم سے بنی نوع انسان کو عنایت کیا ہے۔ اسلام قانونِ فطرت کی تجدید اور نوح اور ابراہیم کے قدیم دین کا احیا ہے جس کو نصرانیوں اور یہودیوں نے محرف و منسوخ کر دیا تھا۔ یہ جدید قانون ایک طرف تو ان سختیوں اور بہت سی پابندیوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو موسوی قانون کی رو سے یہودیوں پر عائد کی گئی تھیں، دوسری طرف وہ نصرانیوں کی رہبانیت کو بھی مٹا دیتا ہے، اور ساتھ ہی وہ انسان کی خامیوں، کمزوریوں اور زندگی کی عملی ضرورتوں کا بھی لحاظ کرتا ہے۔

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) علی العموم اپنے داعیوں اور عالموں کو اس قسم کی نصیحت فرماتے تھے کہ "نرمی کرو، سختی نہ کرو۔ خوش خبری سناؤ، تنفر نہ کرو"۔ قرآن کہتا ہے کہ "اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"۔ اسلام میں تصوف کا رجحان تو موجود ہے لیکن جوگیت اور سنیاس کا رجحان بالکل نہیں۔ وہ صریح طور پر عبادت و ریاضت میں ایسی شدت کو ناروا قرار دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ انسان کا جسم کمزور ہو جائے اور اس کی فطری قوتیں دب جائیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو خدا کی عنایت کی ہوئی "طیب چیزوں" سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے۔ صرف اتنی شرط ہے کہ مسلمان حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے، اور ان قرآنی احکام کی پابندی کرے جن کی تعداد فی نفسہ نہ تو زیادہ ہے اور نہ وہ نہایت سخت ہیں۔

اسلامی قانون ہر عملی جد و جہد کی حمایت کرتا ہے۔ اس کی نظروں میں زراعت، تجارت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۔ آنے والے ہر نبی کو جھٹلائیں، اور نبی کو جھٹلانے کے معنی کفر کے ہیں۔ پھر کیا کوئی پیغمبر اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے سکتا ہے کہ اس کے بعد کوئی سچا نبی آنے والا ہو اور وہ اپنی امت کے لیے ایسی کوئی ہدایت چھوڑ جائے جو اس نبی کی تکذیب، یعنی کفر صریح کے لیے حجت بن سکتی ہو؟ ـ ترجمان القرآن

اور ہر قسم کے کاروبار کی بڑی وقعت ہے ۔ وہ اپنی زندگی کا بار دوسروں پر ڈالنے کو سرزنش کرتا ہے اور ہر فرد بشر سے اس بات کا خواہاں ہے کہ وہ اپنی گذر بسر اپنی ذاتی محنت کی کمائی پر کرے ۔ اس طرح اسلام ہر ایسے پیشے کو معزز سمجھتا ہے جس کے ذریعے انسان اپنے آپ کو دوسروں سے آزاد رکھ سکے بقول رینان "اسلام تو انسانوں کا مذہب ہے" اس لیے اس کی روح کا لحاظ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی قانون کا میلان ہر انسان کو وسیع ترین حدود تک جدوجہد کرنے کی اجازت دیتا ہے اور جب اسلامی قانون کے ترجمان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کے قانون کا بنیادی اصول آزادی ہے تو ہم کو ان سے پورا اتفاق کرنا پڑتا ہے ۔

لیکن یہ آزادی یا اباحت لامحدود نہیں ہو سکتی ۔ انسان فطرۃً لالچی اور ناشکرا واقع ہوا ہے وہ دوسروں کے مال و دولت پر حریصانہ نگاہیں ڈالتا ہے ، اپنا مال خرچ کرنے میں بخل کرتا ہے ، کاہلی کی طرف مائل رہتا ہے اور اللہ کی عنایت کی ہوئی برکتوں کا شکر ادا نہیں کرتا ۔ اگر اللہ ہر فرد کو اپنی من مانی خواہش پورا کرنے کے لیے ، یعنی تمام افراد کو ناانصافی و مضرت رسانی کے لیے آزاد چھوڑ دے تو پھر انسانی تمدن کی تشکیل ہی ناممکن ہو جاتی ہے ، حتیٰ کہ کوئی فرد بشر اپنا وجود باقی رکھنے کے قابل نہیں رہتا اس لیے اللہ نے انسانی سعی و کوشش کے لیے ایک حد مقرر کر دی ہے ۔ "حد" ٹھیک وہی چیز ہے جسکو ہم قانون یا حکم کہتے ہیں جو بعض چیزوں کو حلال اور بعض چیزوں کو حرام قرار دے کر انسانی عمل کو ایک حد تک پابند کر دیتا ہے ۔ اس طرح انسان کے دور وحشت کی آزادی پر مناسب روک قائم ہو جاتی ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو سکے فرد یا جماعت کے لیے آزادی کو فائدہ مند بنایا جا سکے۔

ظاہر ہے کہ کوئی قانون چند قانونی اہمیت رکھنے والی مقررہ صورتوں کے علاوہ تمام جزئی تفصیلات پر حاوی نہیں ہو سکتا ۔ رومی قانون سازوں نے کہا ہے کہ "قانون کی خصوصیت حکم دینا ، ممانعت کرنا ، اجازت دینا اور سزا دینا ہے"۔

اسلامی قانون اپنی مذہبی نوعیت کے عین مطابق ان خصوصیات میں قانونی مداخلت کے دو بابوں کا اور اضافہ کرتا ہے، یعنی مباحات اور مکروہات۔ سرِدست تعزیراتی شعبہ سے قطع نظر کریں تو ہم کو پورے ایجابی قانون کے پانچ شعبے نظر آتے ہیں۔ اصول کی شکل خواہ کچھ ہی ہو لیکن ان سب کا مقصد و منتہیٰ ایک ہی ہے ـــــ مصالح عامہ۔ اِس طرح شریعت جو مبدا کے لحاظ سے الٰہی اور موضوع کے لحاظ سے انسانی ہے، اس کا مقصد سوائے نوع انسان کے فائدے کے اور کچھ نہیں ہے۔ یہ مقصد خواہ بہ نظر اول نمایاں نہ ہوسکے مگر ہے بہرحال ہر حکم میں پیوست، کیونکہ خدا سے کوئی ایسی بات ظہور میں نہیں آتی جس میں اس کی حکمت اور اس کا رحم و کرم نہ پایا جاتا ہو، اور رحم و کرم کا مبداءِ اعلیٰ اسی کی ذات ہے۔

چونکہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے اسلیے اسکی زندگی کے دو رخ یعنی اخلاقی و جسمانی ہیں۔ نوع انسان کی تنظیم کے لیے اللہ نے جو قاعدے یا حدود مقرر کیے ہیں ان میں سے بعض روح سے متعلق ہیں اور بعض جسم سے۔ مذہب اور قانون نمایاں طور پر دو جدا چیزیں ہیں مگر ساتھ ہی وہ ایک دوسرے کے متمم بھی ہیں کیونکہ اپنے مشترک مقصد ـــــ مفاد انسانی ـــــ کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے آپس میں مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں۔ روحانی زندگی کو درست کرنے اور ابدی راحت کی زندگی حاصل کرنے کیلیے انسان کو جن چیزوں پر ایمان لانا چاہیے ان کا تعین عقائد یعنی اصول دین کرتے ہیں۔ ایجابی قانون یعنی شرع جسکے معنے سیدھے رستے کے ہیں، اعتقادات کے ساتھ لزومی تعلق رکھتا ہے، اور یہ ایک ایسا ضابطہ ہے جو دنیاوی اغراض کے لیے انسانی جدوجہد کی راہ نمائی کرتا ہے۔ گویا شریعت اس پورے نظام کا جسم ہے اور عقیدہ اس کی روح۔ اعتقاد کا موزوں مقام قلب یا دوسرے لفظوں میں انسان کی باطنی زندگی ہے۔ ایجابی قانون کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اعتقاد و نیت ایک انفرادی معاملہ ہے جس کا فیصلہ صرف اللہ ہی کرسکتا ہے کیونکہ انسان کے دل کا حال تو صرف وہی جانتا ہے۔ ایجابی قانون کا خاص میدان، انسان کے ایسے اعمال ہیں جن کا تعلق

بیرونی مظاہر سے ہے۔ ان میں بعض اسلام کے بنیادی اصولوں کی پابندی سے متعلق ہیں جیسے اقرار توحید، نماز، روزہ، عشر یا زکوٰۃ اور حج۔ یہاں اعتقاد یا بالفاظ دیگر قلبی اعمال کا کوئی سوال نہیں ہے کیونکہ قلبی معاملات قانون سازی کے اختیار سے باہر ہیں، بلکہ یہاں قلبی اعمال کی جگہ جسمانی اعمال سے بحث ہے یعنے عبادت کی وہ ظاہری صورتیں جو اسلامی قانون کے احکام کے مطابق مسلمانوں پر فرض کی گئی ہیں)۔ یہ فرائض نیز قانون عامہ کے وہ فرائض بھی جن کا ذکر آگے آئیگا حقوق اللہ کہلاتے ہیں۔ ان کا موضوع انسان کے وہ فرائض ہیں جو اس کے خالق سے تعلق رکھتے ہیں اور شخصی پسندیدگی یا ناپسندیدگی پر منحصر نہیں کیے جا سکتے[1]۔

---

[1] فاضل مستشرق یہاں اسلام کے نظام دینی کو سمجھنے میں ایک حد تک قاصر رہا ہے۔ دراصل اسلام میں عقائد، اخلاق، عبادات، اور تمدن و معاشرت (Social life) کو ملاکر جس طرح ایک ہی نظام زندگی کا جزو بنایا گیا ہے اسکی نزاکتوں کو سمجھنا آج بہت سے مسلمانوں کے لیے بھی مشکل ہے، کجاکہ کوئی غیر مسلم عالم اسکی صحیح کیفیت کا ادراک کر سکے روح اور جسم کی تفریق کا جو تصور عام طور پر دماغوں میں پیدا ہو گیا ہے، اسلام میں وہ تصور موجود نہیں ہے۔ اسلام کے احکام میں یہ تفریق نہیں کی جا سکتی کہ ان میں سے بعض روحانی زندگی کے لیے ہیں اور بعض جسمانی زندگی کے لیے۔ ہر وہ حکم جو بظاہر روحانی زندگی کے لیے نظر آتا ہے، جسمانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اسی طرح جو احکام بظاہر جسمانی زندگی کے لیے ہیں ان کا نہایت گہرا، اتنا ہی گہرا تعلق روحانی زندگی کے ساتھ بھی ہے۔ مثال کے طور پر عقیدۂ توحید محض "ابدی راحت کی زندگی" حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ انسان کی پوری دنیوی زندگی میں عدل، تقویٰ، اور صحیح مجاہدہ کی روح پیدا کرنے کے لیے بھی ہے۔ نماز روزہ وغیرہ عبادات صرف خدا سے بندے کا تعلق ہی نہیں جوڑتیں بلکہ ہر ہر بندے کے انفرادی کردار (Personal conduct) اور تمام بندوں کے اجتماعی روابط (Social relations) کو بھی درست کرتی ہیں۔ حرام و حلال کے حدود، تعزیری قوانین اور حقوق و فرائض کے احکام جو بظاہر جسمانی زندگی سے متعلق نظر آتے ہیں، سب کے سب روحانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷ پر)

لیکن انسان صرف روح ہی نہیں ہے بلکہ جسم بھی رکھتا ہے - اس حیثیت سے اسکو اپنا دنیاوی وجود باقی رکھنے کے لیے بھی کچھ کرنا پڑتا ہے - یہیں سے معاشرتی زندگی کی نہایت اہم ضرورت پیدا ہوتی ہے - درالمختار میں ہے کہ "انسان فطرتاً سیاسی حیوان ہے کیونکہ وہ دوسرے حیوانوں کی طرح تنہا نہیں رہ سکتا بلکہ اسکو معاشرت اور باہمی امداد و اعانت کی ضرورت پڑتی ہے" لیکن ہر فرد کے رجحانات جدا، ان کی ضروریات مختلف اور ہر ایک کی قابلیتیں اور قوتیں محدود ہوتی ہیں - انسان اپنے ہم جنسوں سے امداد لینے پر مجبور ہے اس لیے اسکے پیچیدہ اور گوناگوں اغراض، تعلقات اور لین دین کے معاملات پیدا ہوتے ہیں - یہی چیزیں معاشرے کی اصل اور منبع ہیں جن میں سکہ ذریعہ و تبادلہ کا کام دیتا ہے - گذشتہ اقتباس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یونانی خیالات کتنا گہرا اور دور رس اثر رکھتے ہیں - معاشری زندگی سے پیدا ہونے والے تعلقات ہی اثباتی قانون کا مصدر اور اصل موضوع ہیں - نسل چلانے کی ضرورت، صنفی تعلق اور ساتھ ہی خاندان کی تنظیم کا باعث ہوتی ہے، اسلیئے نکاح سے قانونی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۶) زندگی سے بھی یکساں متعلق ہیں - اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی روحانی ترقی ان حدود اور ان فرائض کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کوئی شخص حرام کھا کر، حق داروں کے حق مار کر، اور بندگان خدا پر ظلم کر کے خدا کا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ کوئی عبادت ان گناہوں کے ساتھ نافع نہیں۔ اور کوئی عقیدہ انسان کو حدود اللہ پر تعدی کرنے کے نتائج سے نہیں بچا سکتا - یہ صحیح ہے کہ شرع صرف ظاہری اعمال کو دیکھتی ہے - اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ احکام شرع کو نافذ کرنے والے حکام جو حکم لگائیں گے وہ صرف ظاہری اعمال کے لحاظ سے ہوگا - مگر اسلام میں تمدنی، معاشی اور اخلاقی قوانین کے پیچھے صرف سیاسی طاقت ہی کی قوت نافذہ (Sanction) نہیں ہے، بلکہ اس سے بڑی اور اصلی قوت ہر فرد مسلم کے اعتقاد کی ہے جو اس کو اندر سے بھی قانون کا مطیع بناتی ہے - اس کے نفس کو اطاعت قانون کے لیے تیار کرتی ہے - اسی مقام پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی نظام میں دینی اعتقاد، اخلاقی تصورات، مذہبی عبادات اور تمدن و سیاست کو جمع کر دینے کی جو صورت اسلام میں اختیار کی گئی ہے وہ کیسی نازک اور کمال درجہ کی بصیرت کا نتیجہ ہے - ترجمان القرآن

تعلقات وجود میں آتے ہیں۔ تقسیم عمل اور افراد کی مختلف ضرورتوں سے لین دین اور دوسرے تعلقات کا وہ جال پھیلتا ہے جس کا حوالہ اسلامی متعلق حقوق العباد کے عام نام سے دیتے ہیں۔ اسی کو مغرب میں کشوری (Civil) اور تجارتی قانون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اسکو اسلامی نظام قانون مختلف شاخوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اس خصوص میں رومی قانون میں بھی اسلامی قانون سے زیادہ شعبے نہیں تھے۔ کسی فرد کی موت سے وراثت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس پر ترکے اور تقسیم سے متعلقہ اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ سب سے آخر میں معاشرتی تنظیم کی حفاظت کے لیے تعزیری نظام کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جس کی تفصیل بعد میں آئیگی۔　(باقی)

اعلان

اردو اکاڈمی جامعۂ ملیہ اسلامیہ دھلی نے ذیل کے ہر مضمون پر مبلغ دوسو روپیہ انعام دینا تجویز کیا ہے جن صاحب کا مقالہ سب سے بہتر ہوگا انہیں مذکورہ بالا انعام دیا جائیگا۔ اکاڈمی کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ اس کے علاوہ اکاڈمی منتخب مقالہ جات کے حقوق اشاعت اپنے ذمہ رکھیگی۔ مقالہ میں قریباً پچاس ہزار الفاظ ہونے چاہییں اور تمام مقالے سیکرٹری اردو اکاڈمی کے پاس ۱۵ ستمبر تک پہونچ جانے چاہییں۔ جو صاحب اس مقالہ نویسی میں شرکت پسند کریں وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سیکرٹری کو مطلع کردیں۔

از طرف سیکرٹری اردو اکاڈمی۔ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دھلی

فہرست مضامین :- اشتراکیت، فاشزم، نازی ازم، سامراج، وطنیت، سرمایہ داری، بحیرۂ روم کی سیاست، بحیرۂ اکاہل کی سیاست، امریکہ اور سیاست عالم، وسطی یورپ کی سیاست، نوآبادیوں کی تقسیم، ممالک اسلامی کی سیاست۔